© rasailojaraid.com

ترقی پسند شاعری

از مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی۔ ایم اے۔ پروفیسر سینٹ اسٹیفنس کالج دہلی

یہ مقالہ یکم مارچ ۴۴ء کو سینٹ اسٹیفنس کالج دہلی کی بزم ادب کے زیر اہتمام ڈاکٹر سید اظہر علی صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی (کینٹب) صدر شعبۂ عربی فارسی و اردو دہلی یونیورسٹی کی صدارت میں پڑھا گیا۔ جلسہ میں مختلف کالجوں کے اساتذہ اور طلبار کے علاوہ خواتین اور شہر کے اربابِ علم و ادب بھی تشریف فرما تھے۔ (برہان)

جناب صدر، خواتین و حضرات

اصل موضوع سخن پر گفتگو کرنے سے پہلے یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ میرے نزدیک "ترقی پسند شاعری" یا "ترقی پسند ادب" کی ترکیب اصولاً درست نہیں ہے کیونکہ پسند یا نا پسند کا تعلق شعور و احساس سے ہوتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ ادب بذاتِ خود شعور و احساس نہیں رکھتا۔ اس بنا پر کوئی ادب ترقی پذیر تو ہو سکتا ہے لیکن ترقی پسند نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح میرے خیال میں ترقی پسند شاعری کو "نظم آزاد" سے تعبیر کرنا بھی درست نہیں ہے۔ کیونکہ نظم تو کہتے ہی اس کو ہیں جس میں وزن کی قید ہو کلام کی اب تک صرف دو قسمیں ہی کی گئی ہیں۔ اگر کلام موزوں ہے تو نظم ورنہ نثر ہے۔ اب اگر نظم میں حسنِ وزن کے علاوہ کوئی اور معنوی خوبی بھی ہو تو وہ شعر ہے ورنہ نہیں۔ اسی طرح اگر نثر میں کوئی لفظی یا معنوی صناعی ہے تو وہ انشا ہے ورنہ نثر عاری ہے۔ اس بنا پر کسی کلام کو نظم کہنا اور پھر بے وزن ہونے کے باعث اس کی صفتِ آزاد لانا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص "لاہور کا ہمایوں مقبرہ" یا "دہلی کا مقبرۂ نور جہاں" بولے۔ البتہ ہاں اصطلاحات پر کوئی روک ٹوک نہیں ہو سکتی اس لئے اگر کوئی شخص انفرادی حیثیت میں کسی نثر کو نظم یا کسی نظم کو نثر کہتا ہے تو میں مانتا ہوں کہ اس کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شخصی خوداختیاری حقوق کے پیشِ نظر ایسا کرنے کا حق ہے۔ لیکن اس کی مثال بالکل ایسی ہی ہوگی جیسے کوئی شخص اپنی بلی کا نام کتا یا کتے کا نام لومڑی رکھ لے۔ فنی اعتبار سے اس کو اصطلاحات میں تبدیلی پیدا کردینے کا کوئی حق نہیں ہے۔

بہرحال اب جبکہ ہمارے نوجوانوں کا ایک طبقہ اپنے مخصوص ادب کو ترقی پسند ادب کہتا ہے تو یہ ترکیب اصل کے لحاظ سے خواہ کتنی ہی غلط اور نادرست ہو۔ میں بھی اس مقالہ میں اس ادب کے لئے یہی لفظ استعمال کروں گا۔

ترقی پسند شاعری پر غور کرنے کے سلسلہ میں ہمیں اپنی بحث کو چند حصوں میں تقسیم کردینا چاہیئے۔

(۱) ترقی پسند شاعری کیا ہے؟

(۲) اس کی پیداوار کے اسباب کیا ہیں؟

(۳) ترقی پسند شاعری کے خصوصیات صوری و معنوی کیا ہیں؟

(۴) ان خصوصیات کو ادبی نقطۂ نگاہ سے کیا مرتبہ حاصل ہے؟

ان چار نقاطِ بحث پر غور کرنے کے بعد آپ خود بخود یہ معلوم کرسکیں گے کہ موجودہ ترقی پسند شاعری شعروادب کے ارتقائی منازل میں اپنی کیا حیثیت رکھتی ہے۔ اور کیا وہ ہمارے مستقبل کے لئے اپنے اندر کوئی نویدِ جاں فزا کی حامل ہے۔

مقصد | غالباً ۳۲ء یا ۳۳ء کی بات ہے کہ ترقی پسند ادب کی تحریک ہوئی اور اس کے آغاز میں یہ علان کیا گیا۔

> ہماری انجمن کا مقصد یہ ہے کہ ادب اور آرٹ کو دقیانوسوں سے بچائیں۔ فنونِ لطیفہ کو عوام کی زندگی سے قریب لے آئیں تاکہ وہ حقیقتوں کو پیش کرنے کے ساتھ مستقبل کی دنیا کی طرف ہماری رہبری کریں۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ ہندوستان کے نئے ادب کو آج ہماری زندگی کے اہم مسائل مثلاً بھوک، غریبی، سماجی پستی اور سیاسی غلامی سے بحث کرنا چاہیئے۔ ہمارے نزدیک وہ تمام ادب جو ہمیں سست اور بے کار بنا رہا ہے رجعت پسند ہے اور وہ تمام ادب جو ہم میں تنقیدی قوت پیدا کرے جو عقل کی روشنی میں ہمارے رسم و رواج کی جانچ پرتال کرے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جو ہمارے عمل اور ہماری تنظیم میں مدد دے ترقی پسند ہے "۔

ترقی پسند ادب کا جو مقصد خود اس کے اپنے منشور میں واضح کیا گیا ہے۔ وہ اس قدر صاف اور واضح ہے کہ کسی شخص کو بھی اس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ البتہ اس میں اتنی ترمیم اور ہونی چاہئے کہ زندگی کے اہم مسائل کو بھوک، غریبی، سماجی پستی اور سیاسی غلامی تک ہی محدود نہیں ہونا چاہئے۔ بلکہ جس طرح زندگی خود ایک اتھاہ سمندر ہے۔ جس کی سطح پر کبھی راحت و مسرت کی لہریں اٹھتی ہیں اور کبھی غم اور رنج و الم کی۔ کبھی مایوسی و ناکامی اس گھر میں اپنا آشیاں بناتی ہے۔ اور کبھی ولولہ و امید اس میدان میں اپنی تگ و دو دکھاتے ہیں۔ کبھی اس کا مادی رخ جلوہ نما ہو کر اضطراب و کشمکش کے ہنگامے بیدار کر دیتا ہے اور کبھی روحانیت کا آفتاب اس کے افق پر طلوع کر کے اس کے جسم میں حرارت عمل و اخلاص نیت کی گرمی پیدا کر دیتا ہے۔ اسی طرح ادب کے مقاصد کو بھی ہمہ گیر اور عالمگیر ہونا چاہئے انھیں زندگی کے اور وہ بھی کسی خاص خطہ ارضی کے لوگوں کی زندگی کے چند ایک خاص پہلوؤں میں محدود کر دینا۔ ادب کے بارے میں کسی لائق ستائش دیدہ دری کا ثبوت نہیں ہے۔ اچھا خیر جانے دیجئے اب یہی سہی! لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ترقی پسند ادب ان مقاصد کو کس شکل میں پورا کر رہا ہے اور اس سے ہماری زندگی میں بلکہ صحیح تر یہ ہے عوام کی زندگی میں کیا اثرات و تغیرات پیدا ہو رہے ہیں۔

اسباب ان اثرات و تغیرات کا جائزہ لینے سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لیجئے کہ ادب کا خواہ برائے ادب ہو۔ یا برائے زندگی، بہر حال ادب کا تعلق ہمیشہ زندگی کے ساتھ چولی دامن کا سا رہا ہے۔ زندگی جس قدر زیادہ ترقی کرتی جاتی ہے اور اس میں تہذیب و شائستگی کی وجہ سے جتنا زیادہ سنھراؤ اور نکھار پیدا ہوتا جاتا ہے۔ ادب بھی اسی قدر مہذب اور شائستہ اور ترقی پذیر ہوتا چلا جاتا ہے۔ ادب دراصل زندگی کا عکاس ہے۔ جو رنگ زندگی کا ہوگا وہی اس آئینہ میں نظر آئے گا۔ ہر قوم اور ہر ملک میں یہی ہوتا چلا آیا ہے۔ ہمارا ملک اور ادب بھی اس قانونِ فطرت سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ ولی سے لیکر موجودہ عہد تک کی اردو شاعری پر ایک تحلیلی اور تنقیدی نگاہ ڈالئے تو صاف نظر آئے گا کہ ملکی، معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی اثرات کے ماتحت ہماری زبان کی شاعری کن کن مراحل و منازل سے گذری ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اوراس میں نہ صرف زبان اور محاورہ کے لحاظ سے بلکہ تخیل. اسالیب بیان۔ اور طرزِ ادا کے لحاظ سے بھی کیسے کیسے عظیم الشان اور دور رس انقلابات رونما ہوتے رہے ہیں۔ یہ سماجی اور معاشرتی اثرات جو زبان کے اسالیبِ بیان تک کا رخ پلٹ دیتے ہیں. کس درجہ قوی اور طاقتور ہوتے ہیں اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ مرزا مظہر جان جاناں اور خواجہ میر درد اور حضرت امیر مینائی ایسے مقدس اور ثقہ حضرات بھی شاعری کے میدان میں قدم رنجہ فرماتے ہیں تو ان کو بھی عشقِ حقیقی کے وارداتِ قلب اور عالمِ لاہوت کے سربائے ملکوتی کو بیان کرنے کے لئے وہی اس زمانہ کی عام شاعرانہ بول چال کے مطابق گل وبلبل، رخسار وکاکل، شمع وپروانہ، شیخ وبرہمن اور رقیب ودشمن ایسی چیزوں کے استعارات کی آڑ لینی پڑتی ہے. چنانچہ مرزا غالب نے جن کو" باوصف بادہ نوشی" اپنی ولایت کا یقین تھا کہہ ہی دیا تھا

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو ‌ ‌ ‌ بنتی نہیں ہے بادۂ وساغر کہے بغیر

مقصد ہے ناز وغمزہ ولے گفتگو میں کام ‌ ‌ ‌ چلتا نہیں ہے دشنۂ وخنجر کہے بغیر

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ادب پر ملک کے تہذیبی اور تمدنی حالات کا اثر ہوتا ہے اور ضرور ہوتا ہے۔ وہی لوگ اس میں کامیاب رہتے ہیں جو ان اثرات سے بھاگتے نہیں بلکہ اندر گھس کر ان اثرات کے تند وتیز سیلاب کا رخ کسی مناسب سمت کی طرف پھیر دیتے ہیں۔ اس کے برخلاف جو لوگ ان سے بھاگتے ہیں اور ان سے نفور ہوکر کسی گوشۂ تنہائی میں بیٹھ رہتے ہیں، یا ان اثرات سے دامن بچاکر صحیح سلامت نکل جانا چاہتے ہیں انقلاب کی تیز نگاہ ان کو تاڑ لیتی ہے اور پھر کم از کم لوحِ شہرت و ناموری سے ان کا نام حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا جاتا ہے۔

پس آج کل ہماری شاعری اور ادب میں جو رجحانات پائے جارہے ہیں وہ خالی از علت نہیں ہیں بلکہ نتیجہ ہیں ان سیاسی، تمدنی اور معاشرتی عوامل کا جو گذشتہ جنگِ عظیم کے بعد سے ہندوستان میں کار فرما رہے ہیں. گذشتہ جنگ نے جہاں دنیا کے دوسرے ممالک کے ذہن وفکر میں ایک عظیم انقلاب پیدا کردیا. ساتھ ہی ہندوستان بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا۔ ہمارے بدنصیب ملک کی سیاسی غلامی، روس کا اشتراکی نظام اور اس کا زبردست پروپگینڈہ۔ آمریت اور جمہوریت کی کشمکش۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سرمایہ اور مزدوری کی آویزش باہمی۔ سیاسی غلامی کے لازمی نتیجہ کے طور پر ہندوستان کی اقتصادی بدحالی۔ انگریزی تعلیم و تمدن کا بے پناہ فروغ۔ اور نتیجۃً مذہب اور پرانی روایات سے بیزاری آزادی وطن کا نام لیتے لیتے ہر قسم کی اخلاقی اور سماجی قید و بند سے مکمل طور پر آزاد ہونے کا جذبہ، جدید فلسفہ کے زیر اثر زندگی کی قدروں کا بدل جانا یہ تمام چیزیں ہیں جنھوں نے ملک کے نوجوانوں میں ایک ذہنی اور دماغی انقلاب پیدا کر دیا ہے اور یہی انقلاب فکری و ذہنی ہے جو ہمیں جدید ادب میں کارفرما نظر آتا ہے۔

اقبال اور ان کا گروہ | ان عوامل و محرکات نے اردو شعر و ادب کو متاثر کیا اور ایسا ہونا ناگزیر تھا۔ لیکن جیسا کہ اس قسم کے ذہنی اور فکری انقلاب کے موقع پر ہمیشہ ہوا کرتا ہے۔ اب ایک گروہ تو وہ تھا جو خذ ما صفا و دع ما کدر کی حکمت عملی پر عمل کرنا چاہتا تھا۔ اس گروہ کی امامت کا شرف اقبال مرحوم کو حاصل ہے جو مشرقی علوم و فنون، اسلامی کلچر اور ہندوستان کی روایاتی عظمت کی تاریخ سے باخبر ہونے کے ساتھ ساتھ مغربی علوم و فنون اور جدید فلسفہ میں بھی بڑی دسترس رکھتے تھے اور جنھوں نے مغرب کے فلسفۂ زندگی کو جوں کا توں قبول کر لینے کے بجائے اس پر شدید تنقید کی اور رطب و یابس دونوں کا فرق الگ الگ کر دکھایا۔ جدید تمدنی نقطۂ نظر نے زندگی کی قدروں میں جو عظیم تغیرات پیدا کر دیئے تھے اقبال نے نہایت دیدہ دری سے ان میں سے ایک ایک کا جائزہ لیا اور جہاں جہاں مغرب کی فکرِ نو نے ٹھوکریں کھائی تھیں اقبال کی انگشتِ تنقید نے ان سب کی برملا نشاندہی کی۔ پھر اسی کے ساتھ مشرقی اقوام تنازع للبقا کی دوڑ میں جن وجوہ و اسباب کے باعث مغربی اقوام سے پیچھے رہ گئی تھیں اور اس بنا پر طرح طرح کے عوارض و امراض کا شکار بنی ہوئی تھیں۔ اقبال کے نباض قلم نے ان میں سے ایک ایک مرض کی تشخیص کی۔ اور یہی نہیں بلکہ ایک حکیم حاذق کی طرح ان کے لئے ایک کامیاب نسخۂ شفا بھی تجویز کر دیا۔

اقبال جیسے شاعر دنیا میں کبھی کبھی پیدا ہوتے ہیں اور درحقیقت وہ قوم بڑی ہی خوش نصیب ہے جس کو اقبال ایسا حکیم شاعر ملے۔ اقبال اپنا پیغام سنا کر دنیا سے چل بسے۔ لیکن انھوں نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کشمکش قدیم وجدید کی تاریکیوں میں اپنی شاعری سے ایک ایسی شمع روشن کردی تھی جس نے میدانِ شعروادب کے شہسواروں کے لئے مینارۂ ہدایت کا کام کیا۔ اور اردو ادب کی دنیا کا گوشہ گوشہ اقبال کے ترانوں یا انھیں ترانوں کی صدائے بازگشت سے گونج اٹھا۔ آج کل کے پرانے اور تجربہ کار شاعروں میں سیماب اکبرآبادی اور ظفر علی خاں اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ جن کی شاعری مغربی تہذیب وتمدن سے مرعوب نہیں بلکہ وہ خود اپنا ایک مستقل پیام رکھتے ہیں۔ اور شورشِ امروز میں دنیائے مستقبل کی تعمیر کی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔

ان اکابر شعروادب کے علاوہ نوجوانوں کا بھی ایک جمِ غفیر ہے جو شعر ونظم کی پرانی روایات پر سختی سے قائم رہتے ہوئے جدید رجحانات کی ترجمانی کررہا ہے اور وقت کے تقاضوں کا صور پھونک کر قوم کے دل ودماغ کو بیدار کرنے کی سعی میں مصروف ہے۔

ترقی پسند گروہ | یہ تمام شعرا اردو شعر پر اثراتِ جدید کے نمائندہ ہیں۔ لیکن اس گروہ کے بالمقابل اب ایک نیا گروہ پیدا ہوا ہے جو اپنے آپ کو فراری شاعر یا ادیب کہتا ہے اور یہی وہ گروہ ہے جو آج کل "ترقی پسند شاعری" کی نمائندگی کررہا ہے۔ یہ گروہ خیالات۔ افکار۔ طرز ادا۔ زبان اور انداز بیان غرض یہ ہے کہ ہر اعتبار سے باغی اور نہایت شدید قسم کا باغی ہے۔

بعض قدامت پرست حضرات اپنے خیالات میں اس قدر جامد ہوتے ہیں کہ وہ کسی چیز میں کسی قسم کی جدت اور اپج کو گوارا ہی نہیں کرسکتے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ بدعت اگر بدعت حسنہ ہو اور جدت اگر جدتِ طیبہ ہو تو ہمیں نہ صرف یہ کہ اسے خوش آمدید کہنا چاہیے بلکہ اسے اپنے دل کی گہرائیوں میں جگہ دینی چاہیے۔ اسی طرح کی جدتیں شاعری اور ادب کی ترقی اور ان کے ستھراؤ اور نکھار کی ضامن ہوتی ہیں عربی زبان جس کا علم عروض سب سے زیادہ باقاعدہ اور مکمل ہے۔ اور فارسی اور اردو بھی جس کے نقش قدم پر چلتی رہی ہے۔ اگر آپ اُس کے ادب کی تاریخ پر نظر ڈالیں گے تو معلوم ہوگا کہ عربی شاعری میں بھی عجیب وغریب قسم کے انقلابات پیدا ہوتے رہے ہیں۔ یہاں تک کہ یہ تغیرات وزن میں ہوئے۔ ابن رشیق القیروانی نے اپنی کتاب العمدہ میں اور اردو میں شمس العلما مولانا عبدالرحمٰن صاحب نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مرآۃ الشعر میں ان کا ذکر کیا ہے۔

اس بنا پر یہ ظاہر ہے کہ جدت یا اجتہاد سے محض اس لئے ہم کو متوحش نہیں ہونا چاہئے کہ وہ جدت ہے بلکہ دیکھنا یہ ہے کہ جدت مفید ہے یا نہیں؟ اور اس سے کسی اچھے مقصد کی تکمیل ہو سکتی ہے یا نہیں؟

اب آیئے اسی نقطۂ نظر سے موجودہ ترقی پسند شاعری کا جائزہ لیں۔

نظم کے عناصر ثلاثہ

لیکن اس شاعری کا جائزہ لینے سے پہلے بہ طور مقدمہ یہ بات ذہن نشین ہو جانی چاہئے کہ کلام خواہ نثر ہو یا نظم آن چند الفاظ مفردہ کا مجموعہ ہوتا ہے جو کسی معنیٰ مفید کا فائدہ دے۔ پھر اسی کلام میں شعریت اس وقت پیدا ہوتی ہے جبکہ معنی میں کوئی رنگینی، لطافت اور ایک ادائے دلکش بھی ہو۔ ورنہ محض محض کسی کلام موزوں کو موزوں ہونے کی وجہ سے شعر نہیں کہا جا سکتا" ایسا غیر شاعرانہ کلام موزوں، "دندان تو در دہانِ تو" سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔

پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ چونکہ کلام کے دو جز ہیں ایک الفاظ اور دوسرے معنی۔ اس بنا پر کسی کلام میں خوبی اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتی جب تک کہ معنی اور لفظ دونوں حسین اور دلکش نہ ہوں لفظ کو لباس کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے اور معنی کو جسم کے ساتھ۔ بعض لوگوں کے نزدیک ان دونوں میں روح اور جسم کا علاقہ ہے۔ بہرحال کلام میں حسن پیدا کرنے کے لئے دونوں کا حسین ہونا ضروری ہے۔ لفظ کا حسن یہ ہے کہ وہ فصیح و بلیغ ہوں۔ مراد کے ظاہر کرنے میں بالکل واضح اور صاف ہوں کانوں کو اجنبی اور نامانوس نہ معلوم ہوتے ہوں۔ اس ذیل میں تشبیہ و استعارہ کی بحث آتی ہے یعنی مراد کو ظاہر کرنے کے لئے جو تشبیہ یا استعارہ استعمال کیا گیا ہے وہ اس درجہ دل کو لگتا اور فہم سے قریب ہو۔ کہ سامع کا ذہن اس کو سنکر تشویش نہ ہو۔ مثلاً فرض کیجئے۔ آپ کسی کی خوبصورتی کو بیان کرنا چاہتے ہیں تو بطور استعارہ اسے پھول، چاند، سورج، ستارہ کہنا درست ہوگا۔ لیکن اگر آپ تیغ ابدار یا ہاتھی کا دانت کہنے لگیں تو یہ استعارہ حسن نہ ہوگا بلکہ قبیح اور مذموم ہو جائے گا۔

ایک دوسری مثال سے اس طرح سمجھئے کہ شیر جس طرح بہادر ہوتا ہے اسی طرح اس کے منہ میں سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انتہا درجہ کی بدبو بھی آتی ہے۔ اب فرض کیجئے آپ ایک شخص جو نہایت درجہ بزدل اور ڈرپوک ہے اس کو دیکھکر کہتے ہیں کہ واہ کیا شیر آرہا ہے اور وجہ شبہ بہادری نہیں بلکہ گندہ دہنی ہے تو آپ کا کلام مرتبہ حسن سے ساقط ہوجائے گا اور اسے کوئی اچھا نہ کہے گا۔

اس کے ساتھ ہی الفاظ کا حسن موقع اور محل کے اعتبار سے کلام کو سجانے اور سنوارنے سے پیدا ہوتا ہے یعنی بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کو کنایہ کے پیرایہ میں ظاہر کیا جائے تو مزہ دیجاتی ہیں اور انہیں کو صراحت کے ساتھ کہا جائے تو وہ بات باقی نہیں رہتی۔ مثلاً ایک شاعر کہتا ہے۔

نہ ہم سمجھے نہ آپ آئے کہیں سے پسینہ پونچھیے اپنی جبیں سے

ارباب ذوق جانتے ہیں کہ پہلے مصرعہ میں شاعر نے جس پردہ داری سے کام لیا ہے اس نے شعر کو کتنا اونچا کردیا ہے۔ اسی بات کو اگر شاعر تصریح کے ساتھ کہتا تو سارا لطف کلام مٹی ہوجاتا۔ یا ایک شاعر کہتا ہے۔

ہم بند کئے آنکھ تصور میں پڑے ہوں اتنے میں کوئی چھم سے جو آجائے تو کیا ہو!

ہر صاحب ذوق سمجھ سکتا ہے کہ اس شعر کی جان لفظ "کوئی" ہے اگر اس کے بجائے شاعر معشوق کا نام لے دیتا تو شعر کی شعریت فنا ہوجاتی۔ اسی طرح امیر کہتے ہیں۔

فلک پہ برق جو چمکی تو یاد آئی امیر ادا کسی کی وہ پردہ اٹھاکے آنے کی

اس شعر میں بھی لفظ "کسی" جو لطف پیدا کررہا ہے وہ محبوب کا نام پیدا نہیں کرسکتا تھا۔ اب رہا معانی کا حسن! تو ارباب نظر معانی کو تین قسموں پر منقسم کرتے ہیں۔

(۱) وہ حقائق جو اپنی باریکی اور بلندی کی وجہ سے عام لوگوں کی دسترس سے باہر ہوں۔ شاعر بھی ان کو محض اتفاق سے یا کاوش وتلاش سے پائے۔

(۲) تخیل یا تشبیہ واستعارہ۔ یا کسی لفظی ومعنوی، اصطلاحی وعرفی مناسبت کے جوڑ توڑ سے کوئی ایسی بات بنائے کہ وہ حقیقت نظر آئے۔

(۳) تیسرے یہ کہ خیال فکر کے قریب قریب پہنچ جائے اور تخیلات میں بھی برہان واستدلال کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رنگ آجائے اور شعر تمثیل و تعمیل بن جائے۔ اس تقریر سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ معنی کا حسن اس وقت ظاہر ہوتا ہے جبکہ یا تو متکلم کوئی ایسی حقیقت ظاہر کرے جو عام لوگوں کے مشاہدہ و خیال سے دور ہو، یا وہ کوئی پیش پا افتادہ خیال ہی ادا کرے۔ لیکن تخیل کی ایسی رنگینی کے ساتھ کہ اس کی وجہ سے معنی میں ایک بانکپن اور دلکشی پیدا ہو جائے۔

پھر کسی خاص موضوع کی تخصیص نہیں بلکہ آپ دل کی کیفیاتِ غم و نشاط کا نقشہ کھینچیں۔ یا سرمایہ داری کے مظالم کا ماتم کریں۔ مضامینِ حسن و عشق بیان کریں۔ یا مذہب و روحانیت پر کچھ ارشاد فرمائیں۔ گل و بلبل کے راز و نیاز اور پروانہ و چراغ کے سوز و ساز کی حکایت ہو، یا فیشزم ملوکیت اور آئینی ظلم و استبداد کی قہر سامانیوں کا تذکرہ۔ بہرحال جو بات کہی جائے وہ عام لوگوں کی سطح سے بلند ہو کر ایسے موثر اور دلکش پیرایہ میں کہی جائے کہ لوگوں پر اس کا اثر ہو۔ بس یہی حسنِ کلام ہے۔

کلام کی یہ خوبی جو الفاظ و معانی دونوں کے حسن سے پیدا ہوتی ہے یہ تو وہ خوبی ہے جو نثر اور نظم دونوں میں مشترک ہے۔ اب اس کے بعد نثر اور نظم میں جو تفریق ہوتی ہے وہ صرف وزن سے ہوتی ہے۔ وہی ایک خوبصورت کلام اگر موزوں ہے تو نظم ہے ورنہ لطیف نثر یا انشا یا خطابت ہے۔ یہ جو کچھ عرض کیا گیا اس سے صاف طور پر یہ نتیجہ نکل آتا ہے کہ نظم کے وجود اور اس کی خوبی کے لئے تین چیزوں کا پایا جانا ضروری ہے۔

(۱) کلام کا موزوں ہونا۔

(۲) الفاظ کا حسین ہونا۔

(۳) معانی کا حسین ہونا۔

پس یہی[۱] وہ معیار ہے جس پر ہر نظم کے حسن و قبح کو جانچا جا سکتا ہے۔ اور یہ ایسا دائمی اور

---

[۱] شعر اور نظم کے لئے وزن ضروری ہے یا نہیں اس کی تفصیل کے لئے شعر العجم مولانا شبلی۔ مرآۃ الشعر مولانا عبدالرحمن۔ دبیرِ عجم مولانا اصغر علی روحی ملاحظہ فرمائیے یہ تینوں حضرات شعر کے متعلق قدیم و جدید مشرقی اور مغربی دونوں قسم کے (باقی صفحہ ۲۱۷ پر)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

غیر متزلزل معیار ہے جو بہر حال شعر و ادب کے گوناگوں تغیرات کے باوجود قائم رہتا ہے۔

وزن میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ اشعار کے لئے علم عروض میں جو اوزان مقرر ہیں بعد والوں نے جدت طبع سے کام لیکر ان میں بہت کچھ اضافے کئے ہیں اور کانٹ چھانٹ بھی کی ہے۔ جس طرح آج ترقی پسند شاعری میں ایک مصرعہ ایک پوری سطر کا ہوتا ہے اور دوسرا اس مصرعہ کا ½۔ اسی طرح پہلے شعراء نے بھی اس قسم کی اپج کی ہے۔ مثلاً بحر ہزج کے ارکان مفاعیلن مفاعیلن آٹھ مرتبہ ہیں۔ چار بار مصرعہ اول میں اور چار مرتبہ مصرعۂ ثانی میں۔ ایک صاحب نے فارسی میں جدت یہ کی ہے کہ اس بحر کے ارکان کو دگنا کردیا یعنی بجائے ہشت رکنی کے شانزدہ رکنی میں شعر لکھا ہے جس سے ایک مصرعہ ایک سطر کا ہو گیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

بیا بتے بجانِ ما، شبے بمہمانِ ما، کے غم نہانِ ما، بگوشِ جان شنودمے
ببیں بحالِ زارِ ما، بجانِ بیقرارِ ما، بہ سینۂ فگارِ ما، زروئے۔ بچینِ نے

اقلیمِ سخن کے تاجدار حضرت امیر خسرو اپنی جدت پسندی کے لئے مشہور ہیں۔ مستزاد خود ایک جدت تھی۔ امیر خسرو نے مستزاد در مستزاد لکھا ہے۔ فرماتے ہیں

از نغمۂ بلبل چہ خبر بادِ صبا را	از نالۂ و آہے	ہر شام و پگاہے
ہر چند نیم لائقِ درگاہِ سلاطیں	نومید نیم نیز	از طالع خویشم
شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدا را	گاہے بہ نگاہے	در سالے و ماہے

عروض میں ایک بحر کا نام ہے متقارب جس کے ارکان آٹھ مرتبہ فعولن فعولن ہیں۔ خاقانی ہند استاد ذوق نے یہ جدت کی ہے کہ اس کو دگنا کر کے شانزدہ رکنی بنا دیا ہے۔ سنئے! فرماتے ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۱۴) نقطہائے نظر سے خوب واقف ہیں اور اسی بنا پر انھوں نے اس مبحث پر محققین یورپ کے افکار کو سامنے رکھتے ہوئے بحث کی ہے ورنہ شعر کے لئے وزن کی ضرورت کا بیان تو عربی ادب کی تقریباً ہر چھوٹی بڑی کتاب میں مل جائے گا۔ منہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مری زندگی تھی ابھی اے ستمگر، مسیحائی جو کر گئی تیری ٹھوکر
کہ ٹھکرایا تو نے تو تھا یہ سمجھ کر، نکل جائے جاں کچھ جو سدرمق ہو

اگر زخمِ سینہ سے پھاہا اٹھاؤں تو خورشیدِ محشر کو تپ سا چڑھاؤں
اگر پنبۂ داغِ دل کو دکھاؤں تو صبحِ قیامت کا منہ دم میں فق ہو

اس بحر میں کیا برجستہ غزل اے ذوق یہ تم نے لکھی ہے
ہاں وزن کو جس کے سن کر شاداں روحِ خلیل و اخفش ہو

اس سلسلہ میں سید انشاء اللہ خاں نے تو کمال ہی کر دیا۔ معلوم ہوتا ہے شاعری نہیں، پہلوانی کر رہے ہیں۔ شیخ مصحفی کی ہجو میں بحرِ طویل میں جو غزل لکھی ہے کس کا حوصلہ ہے کہ ایک شعر ایک سانس میں پڑھ سکے مصرعہ مصرعہ معلوم ہوتا ہے۔ کسی بتِ عربدہ جو کی کاکل پیچاں ہے جس کی لٹیں کھلتی چلی جا رہی ہیں اور درازی میں شبِ فراق سے بھی آگے نکل گئی ہیں [1]

اسی طرح خواجہ حیدر علی آتش اور جرأت سب سے آخر میں مستند شعرا میں سے اقبال نے بھی ایک ہی مصرعہ کے کئی کئی ٹکڑے کر کے بعض نظمیں فارسی میں لکھی ہیں۔ لیکن قابلِ غور یہ بات ہے کہ ان حضرات نے وزن، ردیف اور قافیہ کی پابندی اور حسنِ کلام کا سررشتہ ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے بلکہ امیر خسرو کے مذکورہ بالا شعر پڑھو۔ ان کی جدت نے تو عروسِ سخن کے ساتھ وہ فنِ کارانہ مشاطگی کی ہے کہ شعر شعر بلکہ سچ یہ ہے مصرعہ مصرعہ ایک نگار آئینہ تمثال اور پیکرِ حسن و جمال نظر آتا ہے۔ غور سے دیکھو۔ اس میں معانی کا حسن بھی ہے اور الفاظ کا جمال بھی۔ جملوں کی نشست بھی دلکش ہے اور الفاظ کی بندش بھی چست۔ موسیقی بھی ہے اور ترنم بھی۔ موزونیت بھی ہے اور خیال و ادا کا بانکپن بھی۔ پھر جن لوگوں نے قدم حد سے آگے بڑھایا ان کا کلام فروغ نہ پا سکا۔ مثلاً سید انشاء کی یہ ہجو ہی دیکھئے سید انشاء خود کیسے ہی باکمال اور قادر الکلام شاعر ہوں۔ لیکن ان کی یہ ہجو بارگاہِ سخن میں مقبول نہ ہو سکی۔

---

[1] ملاحظہ فرمائیے آبِ حیات از محمد حسین آزاد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور گویا انشا نے یہ لکھ کر مصحفی کی ہجو نہیں کی بلکہ خود اپنی شاعری کی روشن پیشانی پر کلنگ کا ٹیکہ لگا لیا۔ پس یہ حقیقت بالکل صاف اور ظاہر ہے کہ باعتبار وزن شاعری میں جدت نہ فی نفسہ محمود ہے اور نہ مذموم۔ بلکہ ذوقِ سلیم اور طبعِ مستقیم کے فیصلہ پر اس کے حسن و قبح کا دارومدار ہے اور یہی ہونا بھی چاہیئے۔ کیونکہ شعر تمام تر ایک ذوقی اور وجدانی چیز ہے۔ اس بنا پر شعر اور نظم کی جو متاع اہلِ زبان کے وجدانِ صحیح اور ذوقِ سلیم کے بازار میں نکمی اور کھوٹی ہے وہ بہر حال کھوٹی ہی رہے گی خواہ اس پر کسی دوسری زبان اور ادب کا کیسا ہی خوشنما ٹھپہ لگا لیا جائے۔

افسوس ہے کہ یہ ایک سادہ سی بات ہے جو ہمارے ترقی پسند شاعروں کی نظر سے اوجھل ہو گئی یا تقلیدِ مغرب کے جوش میں انھوں نے قصداً اس کو نظر انداز کر دیا ہے۔

ترقی پسند شاعری اور وزن

ترقی پسند شاعروں نے یہی نہیں کیا کہ شعر کو قافیہ اور ردیف کی قید سے رہا کر دیا ہے بلکہ نفسِ وزن میں بھی کتر بیونت کر کے اس میں ایک ایسی ناہمواری پیدا کر دی ہے کہ پڑھنے میں ترنم تو درکنار ایک عجیب قسم کی الجھن اور خلش ہوتی ہے۔ اور شعر کی صوتی شعریت فنا ہو جاتی ہے۔ مثلاً ن۔ م۔ راشد صاحب کی سائینٹ "خواب کی بستی" پڑھیئے۔ پہلا مصرعہ ہے۔

مرے محبوب جانے دے مجھے اس پار جانے دے

اس کا وزن ہے مفاعیلن۔ مفاعیلن چار مرتبہ۔ دوسرا مصرعہ ہے۔

"اکیلا جاؤں گا اور تیر کے مانند جاؤں گا"

اس میں مفاعیلن تین بار آیا ہے۔ خیر چلیئے یہاں تک تو کوئی مضائقہ نہیں تھا مگر تیسرے مصرعہ میں فرماتے ہیں۔

کبھی اس ساحلِ ویران پر میں پھر نہ آؤں گا

اس مصرعہ کا وزن بھی وہی ہے جو دوسرے مصرعہ کا تھا لیکن اس میں خرابی یہ ہے کہ اگر قاعدہ کے مطابق اضافت کی وجہ سے آپ "ویران" کو نون غنہ سے پڑھتے ہیں تو مصرعہ ناموزوں ہو جاتا ہے اور اگر نون کو ظاہر کرتے ہیں تو قاعدہ کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ترنم اور آہنگ شعر اور نظم کی جان ہے۔ اگر یہ نہ ہو اور وزن کو توڑ مروڑ کر اس کی شکل و صورت کو نثر سے مختلف کرنے کی کوشش کی جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کلام نہ نظم رہے گا اور نہ نثر بلکہ درمیانی درجہ کی ایک اور مخلوق معرضِ ظہور میں آجائے گی۔ ترقی پسند شاعروں میں بعض ایسے ضرور ہیں جو اس بات کا دھیان رکھتے ہیں۔ لیکن بحیثیت مجموعی اس گروہ کا میلان روز بروز اسی درمیانی درجہ کی مخلوق کی طرف بڑھ رہا ہے۔ میراجی اس گروہ کے قافلہ سالار ہیں۔ ان کی نظموں کا مجموعہ میرے سامنے ہے۔ صفحہ صفحہ پر نظر رکتی ہے۔

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجا است

مثال کے طور پر ایک نظم پیش کرتا ہوں جس کا عنوان ہے "آخری عورت" اس کا پہلا مصرعہ ملاحظہ فرمائیے۔

ہجوم دائیں بائیں سامنے دکھائی دے تو مجھکو ایک پرشکوہ سیل کا فسانہ یاد آتا ہے

اس کا وزن بحر ہزج مقبوض کا ہے۔ یعنی مفاعلن جو نو مرتبہ آیا ہے۔ اب اس کے بعد اس میں کتر بیونت ہونی شروع ہوئی۔ چنانچہ دوسرے مصرعہ "بھول جاتا ہوں کہ کون ہوں۔ میں بھول جاتا ہوں یہ کون ہیں" میں ارکان کل پانچ رہ گئے۔ یہاں تک کہ گھٹتے گھٹتے صرف دو رکن رہ گئے ہیں مثلاً "مجھے سفیدہ سحر" یا "لے کے ایسے آئی ہے"۔

پوری نظم کو یہاں نقل کرنا مشکل ہے۔ مدعا یہ ہے کہ اگرچہ یہ نظم ایک عروضی بحر کے ارکان پر مشتمل ہے۔ لیکن شاعر نے روشِ قدیم سے ہٹ کر اور ان ارکان کے چھوٹے بڑے بہت سے ناہموار ٹکڑے کر کے کلام میں اتنے نشیب و فراز پیدا کر دیئے ہیں کہ کلام میں ترنم اور آہنگ جو عروضی اوزان کے خصوصی مقاصد تھے وہ فنا ہو جاتے ہیں اور نظم کم از کم "اردو نظم" نہیں رہتی۔ شعر میں وزن کے ساتھ قافیہ اور ردیف کی پابندی کی جو شرط لگائی گئی تھی اس کا مقصد بھی یہی تھا ہاں یہ صحیح ہے کہ بعض مرتبہ شاعر کے افکار و خیالات اس درجہ نازک یا بلند ہوئے ہیں کہ وہ عروضی پابندیوں کے متحمل نہیں ہو سکتے لیکن ترقی پسند شاعروں کے لئے اس قسم کے عذر کی کوئی گنجائش نہیں ہے کیونکہ انھوں نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اپنے افکار کے جو نمونے پیش کئے ہیں ان کے متعلق کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ اس درجہ نازک یا بلند ہیں کہ عروضی پابندیوں کی زنجیر گراں کا تحمل نہیں کر سکتے۔ مثلاً راشد صاحب "شرابی" ایک نظم میں لکھتے ہیں۔

غم سے مرجاتی نہ تو
آج پی آتا جو میں
جامِ رنگیں کے بجائے
بے کسوں اور ناتوانوں کا لہو
شکر اے جان کہ میں
ہوں افرنگ کا ادنیٰ غلام
اور بہتر عیش کے قابل نہیں

ان مصرعوں کو پڑھیے اور سوچیے کہ معنوی اعتبار سے ان میں ایسی کونسی ندرت اور بلندی ہے جس کی وجہ سے شاعر کو "نظمِ آزاد" کے دامن میں پناہ لینی پڑی ہے۔ اس سے کہیں زیادہ بلند خیال کو عروض کے قواعد و ضوابط کے ساتھ بڑی خوش اسلوبی سے ادا کیا جا سکتا تھا اور اس کا اثر بھی زیادہ ہوتا۔ راشد صاحب ترقی پسند شاعروں میں غالباً سب سے زیادہ لکھے پڑھے اور فہمیدہ و معقول شاعر ہیں۔ لیکن ان کے خیالات کی فلک پیمائی کا عالم بھی یہ ہے کہ میرے لائق دوست پروفیسر ایم۔ ایم بھلا نے جو خود انگریزی زبان کے بڑے اچھے شاعر اور ادیب ہیں "ماورا" پر تنقید کرتے ہوئے بالکل صحیح لکھا ہے۔

"راشد کے ہاں ایک ایک تشبیہ اور استعارہ نظم کا ایک لازمی جز بن جاتا ہے یہاں تک کہ اگر ان کی نظم "بے کراں رات کے سناٹے" میں سے تشبیہات اور استعارات کو خارج کر دیا جائے تو نظم کا عنوان بھی شاید باقی نہ رہے گا۔" [1]

بھلا صاحب کا مطلب یہی ہے کہ راشد کی نظموں میں تشبیہات و استعارات کے گورکھ دھندوں

---

[1] دی اسٹیفینین مارچ ۱۹۴۲ء نمبر ۳۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے سوا فکری لحاظ سے کوئی بلندی نہیں ہوتی۔ چنانچہ اسی تنقید میں آگے چل کر صاف صاف کہتے ہیں "فکری لحاظ سے "ماورا" کی پہلی نظموں کو ہر ایک انسان نظر انداز کر دے گا اور فنی نقطۂ نگاہ سے بھی اس پر بحث کرنا فضول ہے۔" جب "صاحب ماورا" کا یہ عالم ہو تو بس آگے خیر صلاہی ہے۔

قیاس کن زگلستانِ من بہار مرا

ترقی پسند شاعر لاکھ فلک پیمائی کریں لیکن وہ اقبال سے آگے نہیں بڑھ سکتے تو پھر جب اقبال نے اوزان اور ردایف و قافیہ کی پابندی کے ساتھ سب کچھ باسانی کہہ دیا تو اب ہمارے ان شاعروں کے لئے کیا مجالِ گفتگو ہے جن کا اعلیٰ سے اعلیٰ تخیل بھی اقبال کے ادنیٰ سے ادنیٰ تخیل کو نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن ہاں شاعری کی استعداد فطری شرط ہے جس کی وجہ سے شعر الہام بنتا ہے اور قافیہ و ردیف کی تنگ دامانی خیال کو باحسنِ وجوہ ادا کرنے سے مانع نہیں ہوتی ورنہ محض قافیہ اور ردیف سے آزاد ہو جانے کی سہولت کے باعث کوئی "متشاعر" یا "شعرور" شاعر نہیں بن سکتا۔

مزدور اور کسان کی حالتِ زار ترقی پسند شاعری کا سرمایۂ فکر ہے۔ لیکن اسی موضوع پر غیر ترقی پسند شاعر احسان بن دانش اور بعض اور اسی نوع کے نوجوانوں نے جو نظمیں لکھی ہیں کون کہہ سکتا ہے کہ یہ پابند نظمیں حسنِ خیال، قدرتِ بیان، جدتِ ادا، اور اثر آفرینی کے اعتبار سے ان ترقی پسند آزاد نظموں سے کہیں زیادہ کامیاب اور فنکارانہ نہیں ہیں؟ پھر آخر وہ کونسے وجوہ ہیں جن کی بنیاد پر متداول اور مانوس اوزان اور ان کی قیود سے رہائی کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ اپنی بے بضاعتی اور عجز و کم مائگی پر پردہ ڈالنے کے لئے فن کے اصول و قواعد کا خون ناحق کرنا مقتضائے دیانت و شرافت سے کہاں تک قریب ہو سکتا ہے [1]

---

[1] سید انشا کے سامنے ایک صاحب مرزا عظیم بیگ نے جو مرزا سودا کی شاگردی کا دعویٰ کرتے اور اپنے تئیں ہندوستان کا صائب کہتے تھے بحر رجز میں ایک غزل سنائی جس کے کچھ شعر نا موزوں نہیں تھے بلکہ بحرِ رمل میں جا پڑے تھے تو سید انشا نے اس کا مذاق اس طرح اڑایا تھا۔

گر تو مشاعرہ میں صبا آج کل چلے | کہیو عظیم سے کہ ذرا وہ سنبھل چلے
اتنا بھی حد سے اپنی نہ باہر نکل چلے | پڑھنے کو شب جو یار غزل در غزل چلے
بحرِ رجز میں ڈال کے بحرِ رمل چلے

معلوم نہیں انشا مرحوم اگر آج کل ہوتے تو ترقی پسند شاعری کو دیکھ کر کیا فرماتے!

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ دیکھکر مسرت ہوتی ہے کہ ملک کا تمام سنجیدہ اور صاحبِ فن طبقہ اس "بدعتِ سیئہ" کے خلاف جو نظم آزاد کی صورت میں خواہ مخواہ اردو زبان کے سر منڈھی جا رہی ہے بیک آواز و یک آہنگ شدید نفرت کا اظہار کر رہا ہے یہی وجہ ہے کہ اس "طفلِ شریر" کو ابھی تک پنجاب کے ایک خاص حلقہ سے باہر قدم نکالنے کا حوصلہ نہیں ہو سکا۔

جوش ملیح آبادی۔ ترقی پسند شاعروں اور ادیبوں کے "دعا گو" ہیں لیکن یہ جرأت ان میں بھی پیدا نہیں ہو سکی کہ وہ قدیم طرز و وضع اور پرانے اسالیب بیان شاعری کو ترک کر کے نظمِ آزاد کے مہمل راستہ پر چل پڑتے۔ اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بچہ پروان چڑھنے والا نہیں!

حسنِ لفظی و معنوی | ہر شخص جانتا ہے کہ کلام کا مقصد کسی بات کو سمجھنا سمجھانا ہوتا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ترقی پسند شاعری کا مقصد پہیلیاں بوجھنا ہے۔ کسی نے شعر کی تعریف کی تھی کہ "الذی یدخل فی القلب من غیر اذن" یعنی اچھا شعر وہ ہے جو دل میں اجازت لئے بغیر اترتا چلا جائے گویا از دل خیزد و بر دل ریزد کا مصداق ہو۔ لیکن یہاں یہ حال ہے کہ آپ اجازت کیا معنی، شعر کے مطلب اور مفہوم کو بار بار آنے کی دعوت دیتے ہیں لیکن وہ آپ کے دل اور دماغ کے قریب بھی نہیں آتا اور بڑی سادگی سے کہہ دیتا ہے۔

برو ایں دام بر مرغ دگر نہ — کہ عنقا را بلند ست آشیانہ

ترقی پسند شاعری کا تو پورا سرمایہ ہی اسی قسم کی چیستانوں اور پہیلیوں سے بھرا پڑا ہے میں کس کس کو مثال میں پیش کروں۔ اس سلسلہ میں مولانا سیماب اکبر آبادی نے ایک ترقی پسند نظم پر تنقید کرتے ہوئے خوب لکھا ہے اور واقعی وہ نظم بھی بڑی دلچسپ ہے آپ بھی سنئے اور حظ اٹھائیے

گورے جسموں کو جواں رکھتے ہیں بندر کے غدود
ہم کو ترکہ میں ملی ہائے جوانی کی پکار
گرم ملکوں کی کلی آج کھلی کل کو مٹی
بہتے دھارا پہ حبابوں کی بقا کیا معنی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

برف زاروں کی مگر نرگسِ سرمایہ نژاد
صدیاں کھا چکنے پہ افسانوں کی عذرا ہی رہی

آہ وہ عذرا وہ نوخیز دلوں کی مسجود

اف وہ کردار پر اسرار کہ جس کو برسوں
ہالے پہناتے تھے بچپن کے انوکھے سپنے
بربریت میں رہی جس کی جوانی معبود
اس کے اس دور میں معبد تھے تصور اپنے
پھر ہوا گیان کہ ہر شے تھی طلسماتِ خیال
من گھڑت بات تھی اندازِ بیاں سے چمکی
آتشیں غسل سے پائندہ جوانی ہو جائے
یہ کہانی بھی حقیقت کی زباں سے چمکی
اب تو آنکھوں میں تھا عذرائے حقیقی کا جمال
چھب نویلی تھی۔ مگر صبح وہی شام وہی
ایک اک جلوہ تھا خورشید قیامت لیکن
تین سو سال سے تھا روئے دل آرام وہی

جانے پھر کیسے ہوئی حاجتِ نیرنگ شہود
دیکھتے دیکھتے بدلا یہ شبستانِ وجود۔

یعنی سرمایہ کی عذرا نے لیا اور جنم
آتشیں غسل کا جوہر بنے بندر کے غدود
روپ البیلا تھا۔ مہتاب وہی ہم وہی
پھیلی مایا کی مگر چھاؤں خبیث و مردود

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس نئے روپ میں فانی و باقی کی قیود
ایک ہی جنبش ابرو سے تھیں پارہ پارہ
بے اماں گردشِ ایام کی گنگا جمنی
بن گئی لاکھوں برس پہلے کا ٹوٹا تارا

پیرا و فات نے تھک ہار کے ڈالی ہے کمر
اتنا چھینکے سے کہولت کی کمر ٹوٹ گئی
اب تو یا تال نہیں تیروں سے تہی ہے ترکش
اسلحہ خانوں کو فاتح کی نظر لوٹ گئی

شکر ہے ٹلے تو ہوئیں عالم ظاہر کی قیود

حضرت سیماب اس نظم کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

ادب اردو میں جو نظمیں اب تک نظر یاب ہیں، ان کے عنوان چھپا لئے جائیں تو نفسِ نظم سے عنوان کا پتہ چل سکتا ہے۔ اب آپ بتائیں کہ جو آزاد نظم آپ نے ابھی پڑھی ہے اس کا عنوان کیا ہو سکتا ہے؟ بہت غور و فکر کے بعد شاید آپ کہہ سکیں "سرمایہ" پھر مزید غور و فکر کے بعد شاید آپ کہیں "کہولت" پھر نظم کو دوبارہ اور سہ بارہ پڑھنے کے بعد غالباً آپ فرمائیں "عمل تقلیم" پھر شاید آپ کا رومانی مذاق اس کا عنوان قائم کرے "عذرا" مگر آپ یہ سن کر ہنس پڑیں گے کہ اس نظم کا عنوان سرمایہ، کہولت، عمل تقلیم، عذرا وغیرہ کچھ نہیں بلکہ "فاشزم" ہے تمام نظم میں "تین سو سال اور سرمایہ" کے علاوہ کوئی کنایہ ایسا نہیں ملتا جس سے ثابت ہو کہ اس نظم کا عنوان فاشزم بھی ہو سکتا ہے یہ معراج ابہام ہے۔" (نگار لکھنؤ بابت جنوری ۱۹۴۲ء)

پریشاں خیالی کی انتہا یہ ہے کہ راشد صاحب ایک نظم کا عنوان قائم کرتے ہیں "انتقام" لیکن نہایت عریاں انداز میں ہوس پرستی کا ایک واقعہ نظم کرتے ہیں اور آخر میں بتاتے ہیں کہ یہ ہوس رانی اربابِ وطن کی بے بسی اور بے کسی کا انتقام ہے۔ سبحان اللہ! اگر وطن کی بے بسی کا انتقام اسی طرح

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لیا جاتا ہے تو اس سے کون انکار کرے گا کہ ملک کا سب سے بڑا عیاش نوجوان سب سے بڑا محبِ وطن اور قوم پرست ہے!

وائے گر در پسِ امروز بود فردائے

اب ذرا سوچیے جو شاعری خیالات کے اعتبار سے اس درجہ دیوالیہ ہو جس کے افکار میں ناہمواری اور نہایت گندی قسم کی سطحیت بلکہ شہوانیت ہو۔ جس کو گرد و پیش میں انسانی جذبات اور احساسات کے شرمناک اور کمزور پہلو ہی ہمیشہ نظر آتے ہوں۔ جس کی نظریں صنفی میلانات اور جنسیاتی ترغیبات کی بھول بھلیوں میں گم ہو کر رہ گئی ہوں اور جو ہر چیز کو پیٹ، روٹی اور بھوک کی ترازو سے تولنے کی عادی ہو۔ اس شاعری کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے تئیں حقائق زندگی کی ترجمان کہے اور ایک انقلابی کی حیثیت سے ملک میں اپنا تعارف کرائے۔ اگر یہی فحاشی، عریانی، ہزل گوئی اور یاوہ نویسی ترقی پسند شاعری ہے تو ہم سب کو تسلیم کرنا چاہیے کہ عبید زاکانی، جعفر زٹلی، لکھنؤ کے جان صاحب، بلکہ جناب چرکین بھی دنیا کے سب سے بڑے ترقی پسند شاعر تھے۔ افسوس!

زشت روئی سے تری آئینہ ہے رسوا تیرا

اسی ابہام گوئی۔ پریشان خیالی اور یاوہ بیانی کا نتیجہ ہے کہ ہمارے ترقی پسند شاعر ترکیبیں بھی عجیب و غریب اور نہایت مضحکہ انگیز ایجاد کر رہے ہیں مثلاً "رسیلے جرائم" "ڈھلوان سے پھسلتا ہوا شعور" "غم کی رانیں" "زندگی کا پہلا انجان بوسہ" "خوشبوؤں کا تبسم" "افسردگی کی ملائمت" "مجبور احساس سپردگی" "صدیاں کھا چکنے کے بعد" "گنگا جمنی ٹوٹی تارا بن گئی" بجائے "ہار تھک کے" "تھک ہار کے" "تھکن کا نغمہ" "جھومی گیسو کی چھایا" "زنجیر چھنکتی ہی رہے گی" حالانکہ چھنکنا روپیہ وغیرہ کے لئے آتا ہے۔ "پارہ پارہ تھے مری روح کے تار" حالانکہ تار کے لئے ٹوٹنا آتا ہے پارہ پارہ ہونا نہیں آتا وغیرہ وغیرہ

افسوس ہے فحش اور عریاں مضامین پر طبع آزمائی کرتے وقت ترقی پسند شاعروں سے جمالیات کا یہ نکتہ نظر انداز ہو جاتا ہے کہ جمالیاتی نقطۂ نظر سے کسی چیز میں حسن اتنا ہی پیدا ہو سکتا ہے جتنا کہ وہ چیز فطرت اور نیچر سے قریب تر ہو گی۔ فطری عواطف میں حیا کا بھی ایک نمایاں مقام ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس بنا پر اگر کوئی مصور فطری حیا کے مناظر کی روکشی بے حیائی کا رنگ وروغن دے کر کررہا ہو تو اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ مذہب اور اخلاق کا ہی دشمن نہیں بلکہ خود اپنے آرٹ میں پختہ کار نہیں ہے یا کم ازکم خود اپنے فن سے غداری کررہا ہے۔ کسی بے حیائی کے منظر کو عریاں کرکے یہ تو ہو سکتا ہے کہ چند نوجوانوں کے جذبات کو مشتعل کردیا جائے لیکن یہ اشتعال وقتی اور ہنگامی ہوگا۔ اوراس سے وہ سکون اور باطنی سرور حاصل نہیں ہو سکتا جو اچھے اور کامیاب آرٹ کا مقصد ہونا چاہیئے۔ کون نہیں جانتا جو مکالمۂ حسن وعشق باندازِ اشارہ وکنایہ ہو اس میں جو لطف ہوتا ہے وہ اس وقت باقی نہیں رہتا جب کہ معاملہ رازداری اور پردہ پوشی سے گزر کر صراحت اور پردہ دری تک پہنچ جائے۔

اول تو ترقی پسند شاعر جن جنسیاتی مسائل پر زورِ قلم صرف کرتے ہیں۔ کوئی ان سے پوچھے کہ ان مسائل کا آپ کے ان سماجی اور سیاسی مقاصد سے کیا تعلق ہے جن کے لئے آپ انقلاب کا علم ہاتھ میں لیکر نکلے ہیں۔ اگر ن، م، راشد "انتقام" "اجنبی عورت" اور میراجی "ریل میں" اور "اونچا مکان" نہ لکھتے تو ہندوستان کی سیاسی غلامی کی زنجیروں میں اور کتنی زنجیروں کا اضافہ ہوجاتا اور اب ان حضرات نے یہ نظمیں لکھدی ہیں تو اس سے قوم کے کتنے مسائلِ حیات کا حل نکل آیا۔

اچھا! اگر کبھی کوئی ایسا مرحلہ پیش آجائے کہ اس نوع کے مسائل کا ذکر ضروری ہی ہو تو پھر مذہب واخلاق کا نہیں بلکہ خود ادب کا مقتضیٰ یہ ہے کہ ان سے ادیب اس طرح پر گذرجائے کہ بیان واظہار میں کوئی گندگی اور غلاظت نہ پیدا ہو۔ یہی قدرتِ کلام اور احتیاطِ بیان وہ ما بہ الامتیاز ہے جو ایک ادیب اور غیر ادیب میں تفریق پیدا کرتی ہے۔ قدیم شاعری میں ایک نہیں۔ اس قسم کی سینکڑوں مثالیں موجود ہیں لیکن میں یہاں ان کو نقل کرکے سامعین کے ذوقِ لطیف کو مجروح کرنا پسند نہیں کرتا۔

مذہب واخلاق سے بیزاری

ان سب چیزوں سے زیادہ مہلک اور خطرناک ترقی پسند شاعروں کا یہ رخ ہے کہ وہ انسان کی روحانی زندگی سے نہ صرف یہ کہ بے اعتنائی برتتے ہیں بلکہ اس کی تحمیق اور تجہیل کرتے ہیں۔ اس بنا پر اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ نئی نسل کے دماغ جو اس لٹریچر سے اثر پذیر ہوں گے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وہ مادیات میں پاگل ہو جائیں گے اور پھر ان پر بھی لادینی افکار کی مصیبت میں مبتلا ہو جانے کے باعث وہی مصائب ٹوٹیں گے جن کا شکار آج کل یورپ بنا ہوا ہے۔ انسان کی فطرت خدا سے کبھی باغی نہیں ہو سکتی۔ اگر آپ چند خارجی موثرات کے ذریعہ فطرتِ انسانی کو ایک غیر فطری سانچہ میں ڈھالنا چاہتے ہیں تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ آپ فطرت کے باغی ہیں۔ اور اس بنا پر قدرت کے اس انتقام سے نہیں بچ سکتے جو ہمیشہ اس طرح کے باغیوں کے لئے جلد یا بدیر ظہور میں آتا رہتا ہے۔

حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

خاتمہ یہ واضح رہنا چاہئے کہ میں نے اس وقت جو کچھ عرض کیا ہے وہ نظمِ آزاد سے متعلق ہے۔ نظم بے قافیہ میرے نزدیک اس قدر بری نہیں ہے اس کو بعض شرائط کے ساتھ قبول کیا جا سکتا ہے لیکن اس کے لئے ایک دوسری فرصت درکار ہے۔ بہر حال آزاد نظم کے متعلق یہ حقیقت بالکل صاف اور واضح ہے کہ اس نئے اسلوب میں نہ کوئی ادبی خوبی ہے اور نہ سماجی۔ اس میں نہ ترنم ہے نہ خیالات کی ہمواری اور پاکی ہے اور نہ تخیل میں رفعت اور بلندی ہے نہ معنوی حسن ہے اور نہ صوری۔ نہ اس میں زندگی کے حقائق کی رونمائی ہے اور نہ آرٹ کی لطافت۔

تفسیر روح المعانی کامل ۳۰ جلدیں

طبع منیری مصری جدید

علامہ سید محمود آلوسی حنفیؒ کی شہرۂ آفاق تفسیر جس کے متعلق صرف یہ کہدینا کافی ہے کہ مجموعی حیثیت سے اس مرتبہ کی کوئی تفسیر روئے زمین پر موجود نہیں۔ آپ کو مکتبہ برہان دہلی قرول باغ کی معرفت یہ عظیم الشان کتاب مل سکتی ہے قیمت ۲۲۵ روپے محصول ریلوے بذمہ خریدار۔ فرمائش کے وقت ایک تہائی رقم کا پیشگی آنا ضروری ہے۔

© rasailojaraid.com